© rasailojaraid.com

ہو کر اندھیرے میں رینگنا شروع کرتا ہے۔ قدم قدم پر خوف، تعجب اور شبہات سے اسے سابقہ پیش آتا ہے۔ آخر ایک مقام ایسا آتا ہے کہ آگے بڑھنا ناممکن ہوتا ہے۔ یہاں سے "ذوقِ تحقیق" واپس لوٹتا ہے اور غلط سلط نتائج کو جمع کرکے نوعِ انسانی کے آگے لا رکھتا ہے۔ انھیں نتائج کا مرعوب کن نام ہمارے ہاں فلسفہ ہے۔

حقیقت کی نقاب کشائی میں جو حال دوسرے فلاسفہ کا ہے وہی ہیگل اور مارکس کا ہے۔ دونوں نے جہاں تک تجرباتی علم کا تعلق تھا، جہالت کے پردوں کے پیچھے سے حقیقت کے چہرے کی دھندلی سی جھلک ضرور دیکھی لیکن اس کے خدوخال کے تعین میں جہاں قیاس سے کام لیا وہاں دونوں بھٹک گئے اور اپنے پیچھے ایسے غلط نظریات چھوڑ گئے جنھوں نے نوعِ انسانی کا رُخ ایک غلط منزل کی طرف پھیر دیا۔

ہیگل نے اس حقیقت کو تو سمجھ لیا کہ تاریخ اضداد کے تصادم در تصادم کا مسلسل نتیجہ ہے مگر اس سے غلطی یہ ہوئی کہ اس نے تاریخ کو ہر پہلو سے ارتقا ہی کرتے ہوئے دیکھا حالانکہ تاریخ کا ایک عمل "تکرار" بھی ہے۔ مارکس بھی غلط فہمی کی اس لکیر کو آنکھیں موند کر عبور کر گیا بلکہ اس نے "غلطیِ مضمون" کی شراب کو دو آتشہ کرتے ہوئے یہ دعویٰ پیش کیا کہ تاریخ کے عملِ تصادم کو جاری رکھنے والے محرکات صرف معاشی ہوتے ہیں۔ بخلاف اس کے حقیقت یہ تھی کہ تاریخ کا عملِ تصادم مرہونِ منت ہے ان معاشی اور اخلاقی قوتوں کے "اضدادی زوجین" کا جو انسانی ذہنیت میں فطرت نے پیوست کر رکھے ہیں۔ اگر ہمارے ذہنی عوامل صرف معاشی ہوتے تو کوئی تصادم، کوئی کشمکش اور کوئی ہنگامۂ ہاؤ ہو کرۂ زمین پر بپا نہ ہوتا۔ یہ نئے نئے نظریے جنم نہ لیتے۔ یہ تازہ بتازہ فلسفے رونما نہ ہوتے۔ یہ نو بنو قوانین وجود نہ پاتے اور ایک نظامِ زندگی کے پیٹ سے دوسرا نظام تولد نہ ہوتا۔ ہم لوگ بھی بس ادنیٰ حیوانات کی طرح چرتے چگتے چل بستے اور یہ تاریخ کے فلسفے مرتب کرنے کی ضرورت ہی پیش نہ آتی۔ آئیے ان دونوں غلط فہمیوں کو صاف کرتے چلیں۔

قانونِ اعادہ و تکرار فلسفہ کا کام اگر جزئیات سے گذر کر ہمہ گیر اصول و حقائق کو دریافت کرنا ہے تو آئیے دیکھیں کہ کائنات "خطِ مستقیم" پر حرکت کرتی ہے یا اس کی فطرت "دوری حرکت" کا تقاضا کرتی ہے؟

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اصل حقیقت ارتقا ہے یا تکرار؟

مادہ کی اولاد میں شاید سب سے "کہتر بہ قامت" سالمے کا جز ہے۔ اس کی زندگی کا مطالعہ کیجیے کہ وہ کیا شہادت فراہم کرتی ہے۔ پھر دوسری طرف ان بڑے بڑے کروں کی تاریخ پر نظر ڈالیے جو خانوادۂ وجود کے بڑے بڑے رکن ہیں۔ پھر ان خاندانوں کے بڑے بوڑھوں یعنی آفتابوں کا مشاہدہ کیجیے۔ ہر جگہ "وجود" ایک پہیے کی سی گردش میں مصروف نظر آئے گا۔ اس کے محیط کا ہر حصہ بار بار مخصوص نقاط مکانی کو طے کرے گا جنھیں وہ ایک بار طے کر چکا ہے۔ یہ سارا عمل قانونِ اعادہ و تکرار کے ماتحت واقع ہوتا ہے۔ مادی کارخانہ میں یہ جو تخریب و تعمیر کا ہنگامہ برپا ہے، یہ بگاڑ اور بناؤ کا جو فلم دکھایا جا رہا ہے، یہ زوال اور کمال کا جو کھیل "عناصر" کھیل رہے ہیں، یہ محدود سے محدود اور وسیع سے وسیع میدانوں میں ایک ہی شہادت فراہم کرتا ہے کہ دنیا میں "انصراف الآیات" کا ایک غیر مختتم عمل جاری ہے۔

یہ رات اور دن کا چکر، یہ موسموں کی گردش، یہ کیلنڈر کی تاریخوں اور لمحات و آنات کا الٹ پھیر، یہ پودے سے بیج اور بیج سے پودے کی نموداری، یہ گرم اور سرد ہواؤں کے چرخہ کا گھماؤ، یہ انسانی زندگی میں مسرت و الم، صحت و بیماری اور خیر و شر کے مظاہر کا دوران، یہ بھی پکار پکار کر کہہ رہے ہیں کہ یہاں ماضی استقبال کا بھیس بدل کر "حال" کے اسٹیج پر رونما ہوتا ہے۔

یہی اصول کائنات کا ایک جز ہونے کی حیثیت سے انسان کی انفرادی زندگی میں کار فرما ہے۔ اس کی نفسی قوتوں کے "تضادی جوڑوں" کے ارکین بار بار عمل کی سطح پر ابھرتے ہیں اور ڈوب جاتے ہیں۔ اس کے احساسات میں بار بار ایک ہی طرح کے تموج رونما ہوتے ہیں۔ اس کے جذبات میں ایک ہی نوعیت کے طوفان پھر پھر کر تحریک پیدا کرتے ہیں۔ اگر یہ "تکرار" انسانی زندگی میں نہ ہو تو "تجربہ" کا سرے سے امکان ہی نہ رہے اور پھر علم النفس، علم الاخلاق نہ تو تشکیل پا سکیں اور نہ سرے سے ان کی کوئی ضرورت ہی باقی رہے۔

خیر تو آگے چلیے۔ انسان کی حیات اجتماعی اور انفرادی زندگی کے درمیان عملاً کوئی لکیر آج تک نہیں کھینچی جا سکی۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

وہ بہ یک وقت ایک فرد بھی ہے اور ایک اجتماع کا رکن بھی۔ یہ تقسیم صرف نظری ہے۔ فطرت اس تقسیم کو کوئی وزن نہیں دیتی۔ وہ زندگی کو ایک وحدت کی حیثیت سے جانتی ہے۔ لہٰذا اس کے غیر متغیر قوانین کا سکہ اجتماعی زندگی پر بھی اسی طرح رواں ہے جس طرح انفرادی زندگی پر۔ فرد اور اجتماع کے حقوق کے تعین میں جو غلطیاں آج کی جا رہی ہیں وہ کئی کئی مرتبہ کی جا چکی ہیں۔ قانون کی تشکیل میں بے اعتدالی اور اعتدال کے درمیان جو ٹھوکریں صدیوں پہلے کھائی گئی تھیں وہی آج بھی انسانیت کے راستہ میں حائل ہیں۔ تہذیب کے اساسی اصول افراط و تفریط کے درمیان لنگر کی سی حرکت صدیوں سے جاری رکھے ہوئے ہیں۔

لیکن زندگی کے "کولھو" کے گرد پھرنے والے "بیل" کی پیٹھ پر بیٹھا ہوا ہیگل آنکھیں بند کیے ہوئے فتویٰ دیتا ہے کہ "ارتقاء ہو رہا ہے، ارتقاء!" اور اس بیل کی دم پکڑ کر بھاگنے والا مارکس پھولے ہوئے سانس کی رَو میں کہتا ہے کہ — "ہاں یہ ارتقاء ہے اور اس کی وجہ ہے بیل کے معاشی حالات کا تغیر!"

تاریخ اپنے آپ کو دہراتی ہے

مجھے ایک جاپانی ضرب المثل یاد آ رہی ہے کہ:-

"اگر تم پہاڑ کی چوٹی پر بھی چڑھ جاؤ تو تمہیں وہاں بھی انسانی قدموں کے نشان ملیں گے۔"

ضرب المثل یہ بتانا چاہتی ہے کہ انسانی تاریخ میں کوئی چیز "نئی" نہیں ہے کیونکہ جو قوتیں اس کی تعمیر کرتی ہیں یعنی انسانی احساسات اور جذبات اور معاشی و عقلی مقتضیات، وہ باایں ہمہ اختلافِ زمان و مکان یکساں ہیں۔ ان میں "خارجی مہیجات" کے بدل جانے سے کوئی بنیادی تغیر رونما نہیں ہوتا۔ یہ محبت، یہ شہوت، یہ بھوک، یہ کبریائی کی دھن، یہ جذبۂ خدمت، یہ سماج کی پاسداری، یہ ذوقِ خداپرستی ہر عہد میں برسرِ عمل ہیں۔ چاہے ان کے دوائرِ اثر کی وسعت میں کتنا ہی سمٹاؤ اور کتنا ہی پھیلاؤ کیوں نہ ہو۔ بجائے خود ان میں کوئی تبدیلی رونما نہیں ہوتی۔ یہی وجہ ہے کہ جو نیکی یا بدی اس کرہ پر ایک بار عمل میں آ گئی ہے وہ آج تک اپنے آپ کو دہراتی چلی آ رہی ہے اور نہ معلوم یہ "دوہراؤ" کب تک جاری رہے گا۔

"آزمودہ را آزمودن" انسانی غلط کاریوں کی کتاب کا ایک بڑا باب ہے۔ جس طرح انفرادی طور پر

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ایک آدمی غلطی کرتے ہوئے اس غلطی کے معروف انجام سے اپنے آپ کو یہ فریب دے کر آنکھیں بند کر لیتا ہے کہ اس کے پچھلے فاعلوں نے ہشیاری سے کام نہیں لیا تھا اور وہ اسے دوہراتا ہے اور اس کے انجام سے دوچار ہوتا ہے۔ اسی طرح اجتماعی نظام بھی طے کیے ہوئے راستے کو لندھادھند پھر طے کرتا ہے اور علوم و فنون و تعلیم و تربیت کے ذریعہ اس کے علمبردار اپنے آپ کو اور اپنے حریفوں کو دھوکا دیتے رہتے ہیں کہ یہ جو کچھ ہو رہا ہے "جدید" ہے۔ اور ہماری پیش بندیاں اور احتیاطیں اتنی محکم ہیں کہ کسی ایسے نتیجۂ بد کا اندیشہ نہیں جو ماضی میں اس راستہ پر چلنے سے برآمد ہوا تھا۔ کل جو چیز غلط تھی اور انسانی فطرت کے موافق نہیں تھی وہ ماحول کے بدل جانے سے صحیح اور مطابق فطرت ہو گئی ہے ——

انسان تو یہ کالی عینک "آنکھوں پر چڑھا لیتا ہے لیکن فطرت کی آنکھیں حوادث و احوال کو ہمیشہ صاف نظر سے دیکھتی ہیں، اور وہ اپنے فیصلے میں کبھی غلطی نہیں کرتی مختصر یہ کہ اجتماعی پہلو سے بھی انسانی زندگی قانونِ تکرار کی جولانگاہ ہے۔ قانون اور اخلاق کے جزئیات ہوں یا تہذیب کے اساسی اصول، سب ایک گول چکر میں گھوم رہے ہیں اور فلسفہ اطمینان دلاتا ہے کہ ارتقا ہو رہا ہے۔

تاریخ اپنے آپ کو نہیں بھی دہراتی! لیکن فلسفہ بالکل غلطی پر بھی نہیں ہے۔ فی الواقع تاریخ کا ایک ارتقائی پہلو بھی ہے اور اسی پہلو سے تاریخ کا محدود مطالعہ غلط فہمی کا سبب بنتا ہے۔ پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ انسان کے نفسی قویٰ ہر عہد میں جوں کے توں رہتے ہیں۔ فرق جو نمودار ہوتا ہے وہ ذہنی اور تمدنی ماحول میں ہوتا ہے۔ انسان کی دماغی طاقت ایجاد و اختراع کے حربوں سے خارجی دنیا کو بدلتی جاتی ہے۔ اس طرح خود نفسی قوتوں کے لیے نو بنو خارجی محرکات فراہم ہوتے جاتے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ اس عمل و تفاعل سے انسان کی شخصیت کو نمود ہونے کے لیے بہتر سے بہتر پیرایے حاصل ہوتے جاتے ہیں اور اس کا دائرۂ عمل وسیع تر ہوتا جاتا ہے۔ لیکن جہاں تک انسانی قوتوں کے اصول کار کا تعلق ہے، وہ جوں کے توں رہتے ہیں چنانچہ ان قوتوں کے اجتماعی عمل سے جو نظام ہائے حیات رونما ہوتے چلے آ رہے ہیں وہ مظاہر تمدن اور اسبابِ قوت کی حد تک تو ارتقا کر رہے ہیں لیکن اصولِ تہذیب اور اصولِ قانون و اخلاق کے نقطۂ نظر سے ان پر قانون اعادہ و تکرار ہی کار فرما ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

رواں ہے۔ ہر غلط اصول اور ہر صحیح نظریہ بار بار ابھرتا ہے۔ لیکن ہر بار اس کا چولہ بدلا ہوا ہوتا ہے اور ہر بار وہ نئے ہتھیاروں سے مسلح اور جلو میں قوت کے نئے قشونِ قاہرہ لیے ہوئے ہوتا ہے۔ یہ ہے "ارتقاء" اور "تکرار" کے اضدادی جوڑے کے باہمی کارنامہ کی حقیقت۔ اس حقیقت کی وضاحت شاید ذیل کی شکل سے خوب ہو سکے گی:۔

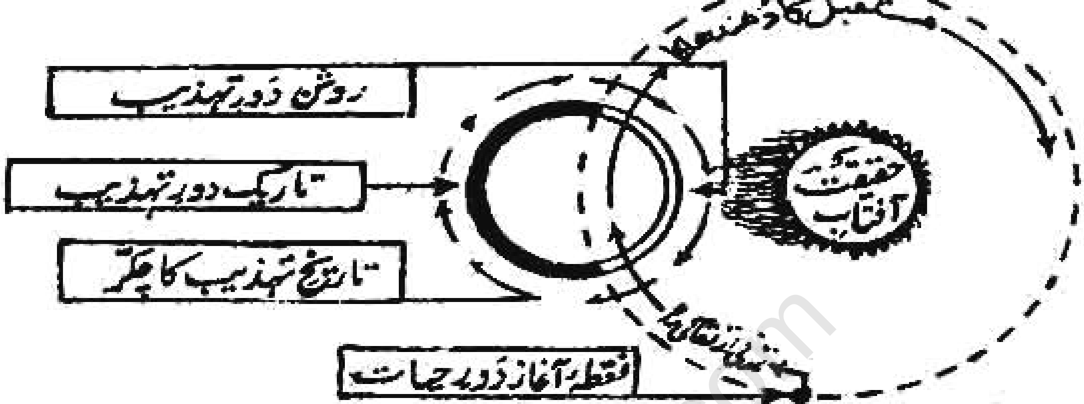

"تُوْلِجُ اللَّيْلَ فِي النَّهَارِ" اور "تُوْلِجُ النَّهَارَ فِي اللَّيْلِ" کا تماشا مٹی کے کروں کی تاریخ ہی میں نہیں بلکہ انسان کی اجتماعی تاریخ میں بھی دکھایا جا رہا ہے جب کبھی مابعد الطبیعی حقائق کا آفتاب براہِ راست انسانی سوسائٹی پر چمکنے لگتا ہے اور درمیانی حائلات ہٹ جاتے ہیں تو اعتدالی اصولِ تہذیب غالب ہونے لگتے ہیں، ایک معتدل قانونِ حیات ان اصولوں کے گہوارے میں پرورش پانے لگتا ہے اور "روشن دورِ تہذیب" کی صبح نمودار ہوتی ہے۔ یہ صبح آہستہ آہستہ دوپہر کے اوجِ کمال کی طرف بڑھتی جاتی ہے۔ دوسری طرف سوسائٹی کے اندر ہی اس کے قائم کردہ نظامِ زندگی کو تباہ کرنے والے عناصر بھی موجود ہوتے ہیں جو اس کے غلبہ کے وقت اسی طرح دب جاتے ہیں جس طرح کسی دوا کی چند تیز خوراکوں سے بعض مزمن امراض کے جراثیم دب جاتے ہیں اور موقع کی تاک میں رہتے ہیں۔ جہاں نظامِ رواں میں ذرا کمزوری نمودار ہوئی یہ عناصر سطح پر آ جاتے ہیں اور پھیلنا پھولنا شروع کر دیتے ہیں۔ تا آنکہ کچھ نئے اصولِ تہذیب، جو در اصل نئے نہیں ہوتے، فلسفہ و حکمت اور ادب و صحافت کے سانچوں میں ڈھل کر پھیلنے لگتے ہیں۔ پھر ایک افراطی یا تفریطی نظامِ حیات خود اعتدالی نظامِ حیات ہی کے پیٹ سے رفتہ رفتہ برآمد ہونے لگتا ہے اور کچھ مدت میں سیاسی تمکن حاصل کر لیتا ہے۔ یہ تاریخِ تہذیب کی رات ہوتی ہے اور اسے فلسفیانہ اصطلاح میں "تاریک دورِ تہذیب[1]" کہا جا سکتا ہے۔ پھر اس دورِ تہذیب کے مخالف عناصر جو دب گئے تھے

[1] (یہ حاشیہ صفحہ ۴۸۲ پر درج ہے)

© rasailojaraid.com

رفتہ رفتہ سر نکالنے لگتے ہیں اور انقلابی مساعی کے اسلحہ سے مسلح ہو کر اس کے خلاف زور لگاتے ہیں۔ الغرض انسانی تاریخ بار بار تاریک اور روشن دوروں کو عبور کرتی ہوئی "تمدنی ارتقاء" کے راستہ پر بڑھی چلی جاتی ہے، جس کا آغاز انسانی پیدائش سے ہوا تھا اور خاتمہ انسانی زندگی کی انتہا پر ہوگا۔

غاروں سے محلات تک، پتھر کے اوزاروں سے دھات کے آلات تک، چراغ سے بجلی تک، گدھوں اور گھوڑوں کی سواری سے ریلوں اور ہوائی جہازوں تک، برہنگی سے دیبا و حریر کے البسہ تک، اشاراتی گفتگو سے شاعری اور کمالِ خطابت تک، تصویری نقوش سے پریس تک جو ایجادات عقلِ انسانی نے کی ہیں اُن سب سے متضاد اصولوں کے علمبرداروں نے یکساں کام لیا ہے۔ دونوں قسم کی تہذیبوں کے ذرائع و وسائلِ کار اور اسبابِ قوت میں یکساں اضافہ ہوا ہے لیکن ان کی کشمکش کا خاتمہ نہیں ہو سکا۔ غاروں میں بسنے والے ننگ دھڑنگ انسان نے بھی اس کشمکش میں حصہ لیا ہے اور آج کا انسان بھی فریقینِ جنگ میں سے کسی نہ کسی کا ساتھ دے رہا ہے۔ بیل گاڑیاں ہانکنے والے ابنِ آدم کے حالات بھی دراصل ایک محدود پیمانے پر بالکل ویسے ہی تھے جیسے وسیع پیمانے پر موٹر چلانے والے خاکی پُتلے کے ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ اس عہد کا مطالعہ کرتے ہوئے ناقد کی نگاہ براہِ راست انسان پر جا ٹھیرتی ہے کیونکہ وہاں دیکھنے کی چیز ہے ہی صرف انسان، لیکن آج پہلی نظر مشینوں، گاڑیوں، ہوائی جہازوں، ریڈیو اسٹیشنوں اور بجلی گھروں کے طلسماتِ ہوش ربا میں الجھ کر رہ جاتی ہے اور تمدن کی چمک دمک اتنی فرصت ہی نہیں دیتی کہ انسان کے ذہنی پہیے کے گھماؤ کو دیکھا جائے۔ یہ اوپر کا ارتقاء نیچے کے عمل تکرار کو چھپانہ دے۔ اصل سوال یہ نہیں کہ اسبابِ حیات و وسائلِ کار میں کتنا اضافہ ہوا۔ اصل سوال یہ ہے کہ انسان نے زندگی کی تشکیل کن اصولوں پر کر رکھی ہے۔ سو اس نقطۂ نظر سے غور کرنے والا دماغ بہرحال اسی نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ آدمی افراط و تفریط اور اعتدال کے نقاطِ سہ گانہ کے دھرے پر گھوم رہا ہے۔

(حاشیہ صفحہ سابق) سلہ "تاریک دورِ تہذیب" بخلاف "روشن دورِ تہذیب" کے اندر دقی طور پر سماجی اور سیاسی انقلاب کی جولانگاہ بنا رہتا ہے۔ اس میں "تصادم در تصادم" کے عمل سے نئے نئے سماجی اور سیاسی نظام فروغ پاتے رہتے ہیں۔ کیونکہ "راہِ اعتدال" کو چھوڑ دینے کے بعد انسان پر بے اعتدالی کی سینکڑوں راہیں کھل جاتی ہیں۔

© rasailojaraid.com

بطورِ مثال کسی ایک اصولِ تہذیب کو لے لیجیے۔ فرد اور اجتماع کا رابطہ کیسا ہونا چاہیئے؟ یہ ایک اساسی مسئلہ ہے۔ اب آئیے اور عرب (قبل از اسلام) کی سوسائٹی کو سامنے رکھیے۔ اس میں شک نہیں کہ جاہلیت کا عرب حکومت کا کوئی واضح اور منضبط نظام نہیں رکھتا تھا لیکن یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ وہاں نظمِ اجتماعی کسی شکل میں تھا ہی نہیں اور اسے جاری رکھنے کی کوئی قوت سرے سے موجود نہ تھی۔ نظمِ اجتماعی یقیناً تھا اور اس کی اساس مسخ شدہ مذہبی مراسم وعبادات، عام اخلاقی ضوابط، آبائی رسم و رواج اور قبائلی مفاہمتوں وغیرہ پر قائم تھی۔ اس نظام نے "انفرادی آزادی" کو انتہا تک پہنچا دیا تھا۔ یعنی اجتماعی ہیئت فرد کے سامنے بالکل بے بس اور بے وزن تھی۔ تاریخ میں یہ دور آیا اور گذر گیا۔ ہم یہی سمجھتے ہیں کہ یہ پھر کبھی نہ آئے گا۔ لیکن یہ ہماری غلط فہمی ہے۔ آج پھر وہی دور عین ہماری آنکھوں کے سامنے کار فرما ہے۔ یورپ کی موجودہ تہذیب کا بنیادی اصول ہی انفرادی آزادی کی حدود کو پھیلانا ہے اور اس اصول سے وہ تمام نتائج برآمد ہو رہے ہیں جو جاہلیت کے عرب میں نمودار ہوئے تھے۔ یعنی سرمایہ داری، عیاشی، فحاشی وغیرہ۔ اب قانونِ فطرت کے مطابق روس[1] میں اس اصول کا ردِ عمل رونما ہوا ہے اور فرد کی شخصیت کو ختم کر کے پوری اہمیت سوسائٹی کو دیدی گئی ہے۔ ان دونوں انتہاؤں کے درمیان جو نقطۂ عدل ہے وہ اگر ابھی نگاہوں سے پنہاں ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہمیشہ پنہاں رہے گا۔ نہیں! شاید حالیہ جنگ کے بعد کوئی گروہ اس نقطۂ عدل کا داعی بن کر اٹھے اور تہذیب کا رُخ پلٹ دے۔

معاشی انتفاع کی بیماری کو لیجیے۔ یہ روگ قبیلوی دور سے لے کر بین الاقوامی دور تک انسان کی جان کا یکساں لاگو رہا ہے۔ افراد افراد سے، قبیلے قبیلوں سے، طبقات طبقات سے اور قومیں قوموں سے بار بار ناجائز انتفاع کرتی رہی ہیں۔ یہ انتفاع کبھی تو مذہب کے مقدس جبّے کو بدنام کرتا ہے، کبھی جاگیرداری کا بہروپ بھرتا ہے،

[1] روس کا انقلاب موجودہ تاریک دور یا تہذیب کا ایک اندرونی (سماجی) انقلاب ہے۔ وہ موجودہ تہذیب کے اصولوں کو یکسر نہیں بدل دیتا بلکہ سماجی تغیرات کے لیے ان میں جزوی ردوبدل کرتا ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کبھی بنکوں اور کارخانہ داریوں کے جال پھیلاتا ہے اور کبھی سیاسی جہاں گیری اختیار کرتا ہے۔ بیماری ایک ہی ہے لیکن اس کے پیرایہ ہائے ظہور جداگانہ ہیں[1]۔

مزید مثال کے طور پر انسان کے صنفی رابطہ کو لیجیے۔ دورِ وحشت میں یہ تعلق بالکل جانوروں کی طرح تھا۔ جہاں جذبات میں تحریک ہوئی صنفِ مقابل کے کسی فرد سے استفادہ کر لیا۔ لیکن اس دور سے آگے نکل کر نکاح کے معاہدے کو صنفی تعلقات کی اساس بنایا گیا۔ اور آپ دیکھتے ہیں کہ اب انسان اس منزل کو عبور کر کے پھر اسی صنفی انارکزم کی طرف لوٹ رہا ہے اور یہ اصول چل رہا ہے کہ شوہر سب کا شوہر اور بیوی سب کی بیوی ہے۔ دوسرے پہلو سے دیکھیے تو عورت کی حیثیت کا مسئلہ ہے۔ بیچاری "شرفِ انسانیت" اور "مظلومیت" کی منزلوں کے درمیان ہچکولے کھاتی رہتی ہے، کہیں یہ "لونڈی" کے درجہ میں نظر آتی ہے، کہیں اسے شرفِ آدمیت حاصل ہو جاتا ہے اور کہیں دوبارہ شرفِ انسانیت سے معزول ہو کر "ہوس کا کھلونا" بن جاتی ہے۔

آگے چلیے "مشورہ" اور "جمہوریت" کی تاریخ کا مطالعہ فرمائیے۔ یہ نعمتِ عظمیٰ تو بالکل جدید دکھائی دیتی ہے حالانکہ عرب، یونان، اور قرونِ وسطیٰ کے ہندوستان سے بھی آگے نکل جائیے اور زمانہ قبل از تاریخ میں اس کا سراغ لگائیے تو وہاں بھی جمہوریت اور شوریٰ کے نمائندے موجود ملتے ہیں۔

بالکل یہی کیفیت جزئیاتِ قانونی کی ہے۔ قانون کی عالمگیر تاریخ سامنے رکھ کر دیکھیں تو معلوم ہوتا ہے کہ حرام بارہا حلال اور حلال بارہا حرام ہوا ہے۔ نہ صرف قانون بلکہ اخلاقی جزئیات کا بھی یہی حال ہے۔ انسانی روابط کی ایک ایک شکل پر کتنی ہی مرتبہ خوش اخلاقی کا لیبل لگایا گیا ہے اور کتنی ہی مرتبہ بداخلاقی کی مہر ثبت ہوئی ہے۔

---

[1] اشتراکیت اس بیماری کا علاج تو کرتی ہے لیکن علاج ایسا تجویز کرتی ہے جو خود بعض دوسری بیماریوں کا موجب ہو سکتا ہے بالکل اسی طرح جس طرح نظامِ جاگیرداری انسانی سوسائٹی ہی کے فائدے کے لیے وجود میں آیا تھا اور جسمِ انسانیت کو بعض بیماریوں سے بچانا ہی اس کا مقصود تھا لیکن اس سے بعض غیر متوقع نتائج رونما ہوئے۔ وقتی ہیجانات کی رو میں بہتا ہوا انسان جب یک رخا مطالعہ کرتا ہے تو فتنہ کا ایک دروازہ بند کرنے کے دوران میں کئی نئے دروازے کھول دیتا ہے تا آنکہ ایک نیا تاریخ تجربہ پایۂ تکمیل کو نہ پہنچ جائے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

خیر اس مضمون میں جزئیات کی تفصیلی بحث کا تو موقع نہیں یہاں تو اصول تہذیب کا تصادم مدنظر ہے لیکن اس کی حقیقت کو سمجھنے کے لیے خود "اصول تہذیب" کی ماہیت کا جاننا ضروری ہے۔ یہ اصول تہذیب کیا ہیں؟

اصول تہذیب انسان کی طبعی زندگی میں مابعد الطبیعی ضروریات کا جو جوڑ لگا ہوا ہے یہ عجیب پیچیدگی کا موجب ہے۔ اس "اجتماع ضدین" کو دیکھ کر عقل کا سر چکرانے لگتا ہے لیکن کیا کیا جائے یہ سارا کھیل ہی اضدادی زوجین کے عمل و تعامل سے چل رہا ہے۔

آدمی اگر جانوروں کا سا دماغ لے کر پیدا ہوتا تو بات آسان تھی کہ کھایا، پیا اور چل بسے۔ مگر مصیبت یہ ہے کہ یہاں بات میں سے بات نکلتی ہے، سوچنا فطرت ہے، اسباب و نتائج کو ڈھونڈنا جبلت میں داخل ہے، حقائق کا کھوج لگانا خو خصلت ہے کیونکہ سوسائٹی میں رہتا ہے اور "آدمیوں کی طرح" رہنا ہے۔ بچارا کارل مارکس کا "معاشی حیوان" انسان بھی واقع ہوا ہے۔ وہ ہوش سنبھالتے ہی یہ سوچنے لگتا ہے کہ میں کیا ہوں؟ زندگی کیا ہے؟ کائنات کا ہنگامہ کیوں برپا ہے؟ چرنے چگنے پر یہ اکتفا نہیں کرتا۔

یہ سوال جو انسان کے دل میں غیر واضح طور پر مابعد الطبیعی امور کے متعلق پیدا ہوتے ہیں انھی کے جواب میں جو نظریات انسان قبول کر لیتا ہے وہی اصول تہذیب کہلاتے ہیں۔ ان اصولوں کی بنیاد پر خاص طرز کے سماجی نظام اور سیاسی ہیئتیں قائم ہوتی ہیں اور ان اصولوں میں ادنیٰ سا تغیر کر دینے سے سماجی نظام اور سیاسی ہیئت میں بہت بڑی تبدیلیاں رونما ہو جاتی ہیں۔ اصول تہذیب کی طرف رہنمائی کرنے والے سوالات یہ ہیں:۔

۱۔ زندگی کا سرچشمہ کیا ہے؟

۲۔ کائنات میں انسان کی حیثیت کیا ہے؟

۳۔ زندگی اسی زمین تک محدود ہے یا یہ رشتہ دراز ہے؟

۴۔ آدمی اپنے سے بالاتر کسی ہستی کے سامنے جواب دہ ہے یا نہیں؟

۵۔ معیار خیر و شر کیا ہے؟

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

۶۔ قانون کا سرچشمہ کہاں ہے اور انسان کے لیے قانون بنانے کا حق کیسے ہے؟

۷۔ عقل انسانی کا میدانِ کار کہاں تک وسیع ہے؟

۸۔ فرد اور سوسائٹی کے رابطہ کی حقیقت کیا ہے؟

__________ وغیرہ[1]

ان سوالات کے جوابات ایک نو وہ ہیں جو فلسفہ اور شاعری کی تبانن الدعوات کتابوں میں ملتے ہیں اور ایک وہ جو الہامی ذخائرِ علم میں پیش کیے گئے ہیں اور ہر پہلو سے ہم آہنگ ہیں۔ موخرالذکر اصولِ تہذیب بار بار روشن ادوارِ تہذیب کی روح بنے ہیں اور ان کے خلاف ظنی نظریات کا جو ابھار رہا ہے اس سے قسم قسم کے تاریک ادوارِ تہذیب کی نمود ہوتی رہی ہے۔ یہ دو مختلف النوعیت اصولِ تہذیب آپس میں متصادم ہیں۔ انسان کی نوعی ذہنیت ان کی پیکارگاہ ہے اور انسانوں کے مختلف گروہ ان کے آلہ ہائے کار بنتے ہیں اور تصادم در تصادم کا عمل جاری رہتا ہے۔

ایک نوعیت کے اصولِ تہذیب جب لٹریچر، نظامِ تعلیم اور صحافت کے کارخانوں میں نفوذ کر کے ایک نئی ذہنیت قائم کر لیتے ہیں تو لوگوں کے زاویہ ہائے نظر بدل جاتے ہیں، معیارِ انتخاب بدل جاتا ہے، سیاسی مذاق بدل جاتا ہے اور ہر طرف ایک ایسے نظامِ حیات کی پیاس پھیل جاتی ہے جو جدید الشیوع اصولِ تہذیب سے کلی مناسبت رکھتا ہو۔ نئی فضا میں پرانے نظام کا دم گھٹنے لگتا ہے اور آخر کار محنت و مشقت سے تیار کی ہوئی عمارت دھڑام سے گر پڑتی ہے۔

آدمی صاحبِ ارادہ و انتخاب ہونے کے باوجود ان متضاد اصولوں کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی بن جاتا ہے۔ لیکن غور سے دیکھا جائے تو یہ اصول خود کٹھ پتلیاں ہیں اور جن تاروں پر یہ حرکت کرتی ہیں ان کا سرچشمہ دھندلا دھندلا نظر آ رہا ہے۔ آیئے ذرا قریب چل کر دیکھیں کہ اس سرچشمہ کے اندر کیا ہو رہا ہے۔

---

[1] یہ سوالات چاہے بظاہر کتنے ہی غیر محسوس کیوں نہ ہوں ہر آدمی ان کے جواب میں نفیاً یا اثباتاً کوئی نہ کوئی حکم ضرور لگاتا ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ذہنِ انسانی کا مطالعہ دریا، پہاڑ، ہوائیں، چاند، سورج، تارے یہ سب کے سب غیر متغیر اصولوں کے مدار پر سرپٹ دوڑ رہے ہیں۔ انھیں کسی "رسہ کشی" میں حصہ نہیں لینا پڑتا۔ کتنی پُرسکون اور پُرامن زندگی ہے۔ انسان کائنات کے انھیں افراد کے پہلو بہ پہلو زندگی بسر کرتا ہے۔ پھر وہ کون سا فرق ہے جو اسے "تصادم در تصادم" کے چکر میں ڈال دیتا ہے۔ یہ ساری مصیبت اختیار و شعور کی ہے۔ ع

دل لے کے ہم تو فتنہ در آغوش ہو گئے

اور اختیار و شعور کا سرچشمہ ذہنِ انسانی ہے۔ یہی ہے اصل مطالعہ کی چیز۔

ادھر لا ناذرا دستِ حنائی

پکڑ لیں چور دل کا ہم یہیں سے

ذہنِ انسانی گوناگوں متضاد قوتوں کا منبع ہے۔ اِن متضاد قوتوں کو اگر دو بڑے حصوں میں تقسیم کر دیا جائے تو ذہن کے اندرونی عمل کو سمجھنے میں آسانی ہوگی۔ ایک لشکر تو مارکس کے معاشی حیوان کا ہے اور دوسرا اس مظلوم غیر معاشی انسان کا جسے دنیا کے اس مشہور فلسفی نے نظر انداز کر دیا۔ معاشی حیوان محض اندھی خواہشات رکھتا ہے۔ اور عقل کی مدد سے انھیں پورا کر لینے کو منتہائے مقصود قرار دیتا ہے لیکن غیر معاشی انسان اجتماعی نظم کے تحفظ کے لیے معاشی حیوان کو بعض حدود میں محدود رکھنا چاہتا ہے۔ یہ ایک الگ مسئلہ ہے کہ انسان محض تجربی عقل کی بنیاد پر صحیح ضابطۂ حیات مرتب کر سکتا ہے یا نہیں اور انسان کے ضابطۂ حیات کا مصنف کون ہو سکتا ہے۔ تاہم ضابطہ کی پیاس جو ہر فرد کو محسوس ہوتی ہے وہ بالکل فطری ہے۔ یہ نہ ہو تو اجتماعی نظم کی تشکیل ہو ہی نہ سکے۔

خیر تو یہ معاشی حیوان اور غیر معاشی انسان اندر ہی اندر اپنا اکھاڑا گرم رکھتے ہیں۔ جب خارجی محرکات کے بل پر خواہشات زور کرتی ہیں تو وہ اخلاقی حس کو دبا لیتی ہیں اور جب اخلاقی حس میں بیرونی عوامل کی وجہ سے اشتعال پیدا ہوتا ہے تو وہ خواہشات کو چت کر دیتی ہے۔ یہ بد عہدیاں، یہ چوری چکاری، یہ فریب دہی، یہ رقص و زنا وغیرہ کے شیاطین غیر معتدل خواہشات کی موجوں پر ہی بہہ کر آتے ہیں۔ اور دوسری طرف ایثار، خدمت، فدا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کاری، احترام حقوق، اور حدود کی پاسداری کے فرشتے اخلاقی حس کے مطلع سے طلوع ہوتے ہیں۔ ایک طرف ہر عہد میں ہمیں وہ انسان ملتا ہے جو انفرادیت کی شراب سے مست ہو کر محض اپنے مفاد کے لیے انسانیت کو زخم لگاتا ہے۔ اور دوسری طرف ہمیں ہر عہد میں وہ انسان بھی نظر آتا ہے جو انسانیت کی خاطر پے در پے چوٹیں کھاتا ہے۔ یہ دونوں کردار اُس عملی تصادم کے نتائج ہیں جو دو متضاد رجحانات میں جاری ہے۔ ہر داخلی و خارجی تاثر ارادہ کی منزل تک پہنچنے سے پہلے اس کشمکش کی بھٹی سے ہو کر گذرتا ہے۔

ان متضاد اندرونی رجحانات کے "نقاطِ مصالحت" بے شمار ہو سکتے ہیں جو مذہب اور تجربی عقل کی مدد سے ایک فرد کے شعور کے سامنے بکھرے رہتے ہیں۔ ان نقاط میں سے ایک تو نقطۂ عدل ہوتا ہے اور اس کے دونوں پہلوؤں پر افراطی اور تفریطی نقاط متعدد ہوتے ہیں اور ان میں کمی بیشی ہوتی رہتی ہے۔ ماحول کے تغیرات ان میں سے بعض کو ابھار دیتے ہیں اور بعض کو شعور کی نگاہوں سے ذرا دُور ہٹا دیتے ہیں۔ اس طرح مختلف سوسائٹیوں میں مختلف فطری مطالبات کو مختلف طریقوں سے پورا کیا جاتا ہے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ فطری مطالبات کو پورا کرنے کا ہر طریقہ صحیح اور مفید ہی ہے۔ مثلاً ایک شخص کے اندر صنفی ہیجان رونما ہوتا ہے۔ اب اس آگ کو بجھانے کے متعدد طریقے اس کے سامنے ہو سکتے ہیں۔ وہ نکاح یعنی صنفی عہد نامہ" کا طریقہ بھی اختیار کر سکتا ہے لیکن اس کے ساتھ کچھ بھاری ذمہ داریوں کا بوجھ بھی اٹھانا پڑتا ہے۔ وہ "زنا بالجبر" کی راہ پر بھی پڑ سکتا ہے لیکن یہ صنفِ مقابل کے حقِ آزادی میں ناجائز مداخلت ہے۔ وہ ایک بیسوا کے آستانے پر بھی سر جھکا سکتا ہے لیکن اس طریقہ سے صنفی خواہش کا اصل مقصود یعنی "تناسل" قطعاً ختم ہو جاتا ہے۔ عام صنفی انارکزم کی سڑک بھی اس کے سامنے کھلی ہے لیکن اس سے "خاندان" کا وہ مرکزی ادارہ خطرے میں گھر جاتا ہے جو اجتماعی تنظیم کے پہیئے کا دُھرا ہے۔ وہ راہب بھی بن سکتا ہے اور خصی بھی ہو سکتا ہے لیکن مصافِ زندگی سے یہ گریز فطرتِ انسانی کو ناگوار ہے۔ یہ سارے نقاط ایسے ہیں جن پر انسان کے متضاد ذہنی رجحانات کی مصالحت ممکن ہے اور ان میں سے ہر نقطہ پر مصالحت ہوتی رہتی ہے۔ انسان کا عملی اور علمی ماحول اسے کبھی کسی نقطہ کی طرف

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

دھکیل دیتا ہے اور کبھی کسی کی طرف۔ بایں ہمہ نقطۂ عدل ایک ہی ہے اور انسانیت ہمیشہ اسی کی طرف اشارہ کرتی رہتی ہے۔

سوچنا یہ ہے کہ کیا وجہ ہے کہ نوعِ انسانی "نقطۂ عدل" یا کسی دوسرے نقطہ پر متحد نہیں ہو جاتی؟ فطرت کی یکسانی کے باوجود ذہنی اختلافات کیوں رونما ہوتے ہیں؟ کیوں نہیں ایسا ہوتا کہ تمام دنیا کے انسانوں کے معاشی اور اخلاقی رجحانات کسی ایک نقطہ مصالحت پر متفق ہو جائیں اور ایک مستقل توازن قائم ہو جائے؟ دراصل ذہن ہے ہی حوادث کی جولانگہ جس میں بگاڑ اور بناؤ کا کھیل کھیلا جا رہا ہے۔ اس سے ہمواری اور یکسانی کا مطالبہ بے جا ہے۔ ذہنِ انسانی کی تشکیل میں تین بڑے عوامل حصہ لیتے ہیں:۔

ا۔ وراثتی اثرات۔ ب۔ تربیت ج۔ ماحول۔

یہ تینوں عوامل ایک انسان کے تمام ذہنی رجحانات اور قویٰ کو متحرک کرتے اور اپنے سانچے میں ڈھالتے رہتے ہیں۔ لیکن یہ عوامل کوئی سے دو افراد کو بھی یکساں میسر نہیں آتے۔ ان کے تنوع کے زیرِ اثر انسانی مذاق، نقطۂ نظر اور مقاصد میں بھی تنوع رونما ہو جاتا ہے۔ یہی عوامل کسی کو محض معاشی حیوان بنا کر رہنے دیتے ہیں، کسی کو اعلیٰ انسانی مقاصد کے عشق میں ایسا مبتلا کر دیتے ہیں کہ وہ اپنے "پیٹ" کو بالکل بھول جاتا ہے۔ کہیں "روٹی" پر قوم و ملت کو بیچ دینے والے جعفر و صادق نمودار ہوتے ہیں اور کہیں قوم و ملت یا انسانیت کے لیے فاقہ کشی کرنے والے دیوانوں کا ظہور ہوتا ہے۔ یہی ذہنی تنوع ایک سوسائٹی میں مختلف علاقی وقانونی تبدیلیوں کی بھوک پیدا کرتا ہے۔ پھر یہ جزئی تبدیلیاں اگر سماج کے سیاسی ادارہ کو بدلے بغیر ممکن نہ ہوں تو سیاسی انقلاب کے لیے مواد تیار ہونے لگتا ہے۔ یا اگر یہ جزئی تبدیلیاں سماجی ہیئت کی نئی تراش خراش کے بغیر رونما نہ ہو سکیں تو سماجی انقلاب کے لیے زمین ہموار ہونے لگتی ہے۔ اسی طرح اگر سیاسی اور سماجی ہیئت کا کوئی مخصوص نقشۂ تعمیر اصولِ تہذیب پر ضرب لگائے بغیر فروغ نہ پا سکتا ہو تو تہذیبی انقلاب ناگزیر ہو جاتا ہے۔

بہرحال انقلاب برپا کرنے والے اصول و نظریات کو تاریخی تصادم جاری رکھنے کے لیے جتنے زنگ و رنگ درکار ہوتے ہیں وہ ذہنی تنوع کی وساطت سے فراہم ہوتے ہیں۔

© rasailojaraid.com

نظریات وخیالات کی جنگ اب ہم اصل نقطۂ بحث پر آگئے ہیں۔ یعنی یہ کہ نظریات وخیالات کی جنگ کس طرح ہوتی ہے۔ اس سوال کو حل کرنے سے پہلے یہ سمجھ لیجیے کہ اصول ونظریات کے اولاً دو اضدادی گروہ ہیں۔ (۱) فطری حقائق جن کی بنیاد پر ایک معتدل نظام تعمیر کیا جاسکے (۲) قیاسات جن کی بنیاد پر مختلف غیر متوازن نظام کھڑے کیے جاسکیں۔ اصل تصادم ان دو گروہوں میں ہے لیکن تصادم در تصادم کا میدان وسیع ہے کیونکہ خود دوسرا گروہ افکار پھر آگے دو بڑے گروہوں میں بٹ جاتا ہے (ا) وہ افکار جن کا رجحان افراط کی طرف ہے (ب) وہ افکار جن کا رجحان تفریط کی طرف ہے۔ پھر ان دونوں انتہائی سروں کے درمیان بے شمار گروہِ افکار ہوسکتے ہیں جن میں سے ہر ایک دوسرے کی ضد ہوتا ہے اور ہر ایک دوسرے تمام گروہوں سے متصادم۔ دیکھیے شکل ذیل :-

ان میں سے مختلف اصول ونظریات کو سوسائٹیوں میں فروغ حاصل ہوتا ہے اور کچھ نہ کچھ علمبردار بن جاتے ہیں جو اگر انھیں ابھار نہ سکیں تو آئندہ نسلوں کی طرف کسی نہ کسی واسطہ سے منتقل کر دیتے ہیں۔

فرض کیجیے "ج" خیال کے علمبرداروں کو "تمکن" حاصل ہو گیا ہے اور انھوں نے اپنے نظریات کی بنیاد پر ایک نظام نافذ کر رکھا ہے۔ اب "ا" سے لے کر "ب" تک تمام گروہ اس نظام سے غیر مطمئن ہیں۔ ان غیر مطمئن گروہوں میں سے ہر گروہ مستقبل کے انقلاب کا علمبردار بننے کے قابل ہوتا ہے لیکن یہ ضروری نہیں ہوتا کہ ہر نظریہ کے حامی ضرور میدانِ عمل میں اتریں اور جتنے گروہ میدانِ عمل میں اتریں، ضرور کامیاب ہو کر نکلیں۔ نہیں، ضروری اسباب کے فراہم ہو جانے سے چند قوتیں میدان میں نمودار ہوتی ہیں[1] اور باقی سطح کے نیچے سانس روکے چند سال یا بعض اوقات صدیوں تک اچھے موقع کا انتظار کرتی رہتی ہیں۔ پھر جو گروہ سطح پر تموج پیدا کرتے ہیں ان میں سے

[1] یاد رہے کہ اس ساری حرکت کے دوران میں مختلف گروہوں کے درمیان ٹوٹ پھوٹ کا عمل جاری رہتا ہے۔

© rasailojaraid.com

جو کوئی اسبابِ قوت پر قبضہ پا لیتا ہے وہ دوسروں کو نگلتا جاتا ہے اور آخر کار اپنے اصولوں پر ایک نیا نظام زندگی قائم کر دیتا ہے۔ پھر اس کے خلاف قوانینِ فطرت کے تحت دوسری طاقتیں زور لگانے لگتی ہیں۔

اب ہمارا موضوعِ فکر یہ ہے کہ غالب ہونے والا گروہِ افکار کس راستے سے گذر کر تمدن کی قیادت پر پہنچتا ہے اور اس راستے کے سنگہائے میل کیا ہوتے ہیں؟

انقلاب کا راستہ جیسا کہ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں، ہر انقلاب کی داستان انسان کے انفرادی ذہن سے شروع ہوتی ہے۔ چاہے اس انفرادی ذہن کو ایک خاص طرزِ فکر اجتماعی نظام کے موثرات ہی کے طفیل حاصل ہوتا ہو۔ پھر فرد کی "خودی" ظہور چاہتی ہے اور اپنی تجلیات کو محدود یا وسیع طریقوں سے دوسروں پر منعکس کرتی رہتی ہے۔ ہر شخص اپنے نظریات کی حفاظت اور پرورش میں کچھ نہ کچھ کوشش صرف کرتا ہے۔ چاہے یہ کوشش زبان سے ہو یا قلم سے یا عمل سے۔ مگر بڑی مشکل اسے یہ پیش آتی ہے کہ جب نظمِ اجتماعی بالکل جداگانہ اصولوں پر قائم ہو تو اس کے لیے اپنی عملی زندگی کو اپنے اصولوں کے مطابق تعمیر کرنا ممکن نہیں ہوتا۔ مخالفانہ اجتماعی فضا میں اس کی خودی کا دم گھٹنے لگتا ہے اور وہ مجبور ہوتی ہے کہ حتی الامکان فضا کو بدلنے کی کوشش کرے۔ لیکن دوسری طرف نظمِ اجتماعی بغاوت برپا کر سکنے والے عناصر پر سہولتِ کار کے دروازے بالکل بند رکھتا ہے اور مسلح طاقتوں کا پہرہ ان پر بٹھا دیتا ہے۔ وہ ایک ہاتھ میں موت اور دکھ اور ذلت کا پروانہ لیے ہوئے ہوتا ہے اور دوسرے ہاتھ میں مناصب کا فرمان اور روٹی ہوتی ہے۔ بیچارا مخالف عنصر صرف یہ کہ اپنے اصولوں کی خدمت نہیں کر سکتا بلکہ الٹا اس کو دشمن کے ہاتھ اپنی پوری قوتیں فروخت کرنی پڑتی ہیں۔ زبان پر قانون کی مہریں لگی ہوتی ہیں اور قلمدانوں پر آرڈیننسوں کا سکہ جاری ہوتا ہے۔ ایسے حالات میں صرف وہ لوگ "جراتِ رندانہ" سے کام لے سکتے ہیں جن کی خودی ذاتی اثرات، تعلیم و تربیت اور خارجی ماحول کے اثرات کی مدد سے بہت پختہ ہو چکی ہو۔ پھر چونکہ مادی قوت کے حصول کا راستہ تنظیم کی وادی سے ہو کر گذرتا ہے لہٰذا ایک تنظیمی قابلیت رکھنے والے لیڈر کا زمام کار کو ہاتھ میں لینے کے لیے سامنے آ جانا ضروری ہوتا ہے۔ اس کے بعد کامیابی کا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

انحصار اس امر پر ہوتا ہے کہ قوت کے سرچشموں پر کہاں تک قابو پایا جاتا ہے۔ گویا انقلاب کے لیے حسبِ ذیل ابتدائی لوازم ہیں:-

ا۔ جرأت کا پیدا کرنے والے داخلی و خارجی عوامل مہیا ہو جانا۔

ب۔ افراد کے عدمِ اطمینان کو منظم بغاوت کی حد تک پہنچانے کے لیے ایک اچھے لیڈر کا فراہم ہو جانا۔

ج۔ قوت کے سرچشموں سے مناسب استفادہ۔

یہ سارے سامان بیک وقت ہر مکتبِ خیال کے پیرووں اور ہر اصول کے علمبرداروں کو حاصل نہیں ہو جاتے اور جس کو حاصل ہو جاتے ہیں وہ کامیاب ہو جاتا ہے۔ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ یہاں ان تکاتب سہ گانہ پر ایک سرسری نظر ڈال لی جائے۔

ا۔ ماحول

دبے ہوئے گروہ میں عموماً بزدلی، دون ہمتی، خود فروشی، جاہ پسندی، شکم پرستی اور احساس کہتری کے امراض خبیثہ پیدا ہو جاتے ہیں۔ اوپر سے جو طاقت غالب ہوتی ہے وہ قانون، تعلیم، لٹریچر اور آرٹ کے ذریعہ سے ان امراض کے جراثیم کو مزید کمک پہنچاتی رہتی ہے۔ اس طرح محکوموں کا چارہ صرف نومیدیِ جاوید رہ جاتا ہے۔ لیکن قوانینِ فطرت ملتوں کا ساتھ دینا چاہتے ہیں تو اس بدحالی میں امید کی شعاع نمودار ہوتی ہے اور اس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ لٹریچر ماضی کی روایات کا تازہ خون سوسائٹی کی رگوں میں دوڑا دیتا ہے یا ہم عصر سوسائٹیوں کے کارنامے اچانک لوگوں کو مشتعل کر دیتے ہیں یا پھر یہ ہوتا ہے کہ غالب نظام کا تشدد لوگوں میں انتہا پسندانہ رجحان پیدا کر دیتا ہے، اس کے عیوب حد درجہ آشکارا ہو جاتے ہیں اور لوگ اس کے کمزور مورچوں کو دریافت کر لیتے ہیں۔ رفتہ رفتہ اپنی جبلی اور وراثتی اور کسی قدر اکتسابی قابلیتوں کے بل پر زیادہ جرأتِ کردار سے کام لینے والے افراد نمودار ہونے لگتے ہیں اور نظامِ غالب اور اس کے حریفوں میں کھلم کھلا تصادم شروع ہو جاتا ہے۔

بہرحال نظریات کے بیج تاریخ کی کھیتی میں چاہے کتنی دیر پڑے رہیں، کبھی نہ کبھی پھوٹتے ہیں اور ان

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کے سینوں سے انقلابات کے تناور درخت نمودار ہوتے ہیں۔ یہ بیج اس وقت تک مٹی میں دبے رہتے ہیں اور اپنی قوتِ نمو کی حفاظت کرتے رہتے ہیں جب تک زمین نرم نہ ہو جائے اور وقت کی سیاست سے اس کی آبپاشی نہ ہو جائے۔ جہاں یہ دو تبدیلیاں رونما ہوئیں، انقلاب کی بسم اللہ ہو جاتی ہے۔

ب۔ لیڈر اگرچہ ہر نظریہ، ہر اصول اور ہر خیال ابتداءً کسی فرد سے منسوب ہوتا ہے لیکن اس کا عملی نفاذ ایک اجتماعی منظم جدوجہد کے بغیر ممکن نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ ہر نظریہ کو برسرِ عمل ہونے کے لیے ایک ایسے لیڈر کی ضرورت ہوتی ہے جو بکھرے ہوئے افراد کو ایک مرکز پر مجتمع کر کے اس نصب العین کی طرف کھینچ لے جائے جو اس داعیۂ اجتماع ہو اور راستے کے حالات کے خلاف زور لگانے کے لیے "قوت" فراہم کر سکے۔

فرد جب تک فرد ہوتا ہے، اس میں بغاوت اٹھانے کے لیے جرأتِ رندانہ نہیں ہوتی لیکن کسی اجتماعی ہیئت کا پرزہ بن جانے کے بعد اس کا جوشِ کار منزلِ شباب پر پہنچ جاتا ہے۔ اس لیے ہر انقلابی تحریک کو اعلیٰ درجہ کی دماغی و عملی صلاحیتیں رکھنے والے لیڈر کی ضرورت ہوتی ہے جب حسنِ اتفاق سے مطلوبہ لیڈر اچانک اسٹیج پر آجاتا ہے تو اس کی دعوت پر ایک مکتبِ خیال کے منتشر افراد جمع ہو جاتے ہیں تاکہ "راہِ حق با کارواں رفتن" کا طریقِ عمل اختیار کیا جائے۔

لیڈر کے ظہور کا وقت وہ ہوتا ہے جب ایک مکتبِ خیال کے منتشر افراد میں اس کی پیاس بہ شدت محسوس کی جانے لگتی ہے بلکہ یوں کہیے کہ لیڈر کی پیاس ہی لیڈر پیدا کرتی ہے۔ چاہے اس پیاس کے پیدا کرنے اور بڑھانے کی مہم ہونے والے لیڈر ہی نے شروع کی ہو۔ اس پیاس کا احساس گروہوں میں نصب العین کی محبت کے غلبہ سے شروع ہوتا ہے بعدہٗ اس احساس کو خوب بھانپا جا سکتا ہے۔ چنانچہ علامہ اقبال نے اپنی موت سے پہلے ہندوستان کی ملتِ مسلمہ میں اس احساس کی نمود کا مطالعہ کر دیا تھا اور اسی مطالعہ کے نتیجہ میں ایک دعائیہ قطعہ میں نئی قیادت کی پیشگوئی کی تھی کہ :-

اگر می آید آں "دانائے راز" ے　　بدہ او را نوائے دل گدازے
ضمیرِ امتاں را می کند پاک　　کلیمے یا حکیمے نے نوازے

(ارمغان حجاز)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بہرحال منتشر افراد بڑی سے بڑی کوشش کریں تو بھی اپنے نظریات کے تحفظ میں مدافعانہ حرکت کے سوا کچھ نہیں کر سکتے لیکن جماعتی تنظیم کے ذریعے جارحانہ کارروائی شروع ہوتی ہے۔ جارحانہ کارروائی ہی کے لیے تاریخ میں منظم جماعتیں رونما ہوتی ہیں اور یہ تنظیمی مساعی سے فضا میں اپنا اثر پھیلانا شروع کر دیتی ہیں جماعتی تحریکات کا اندازہ ذیل کی شکل سے ہو سکے گا:۔

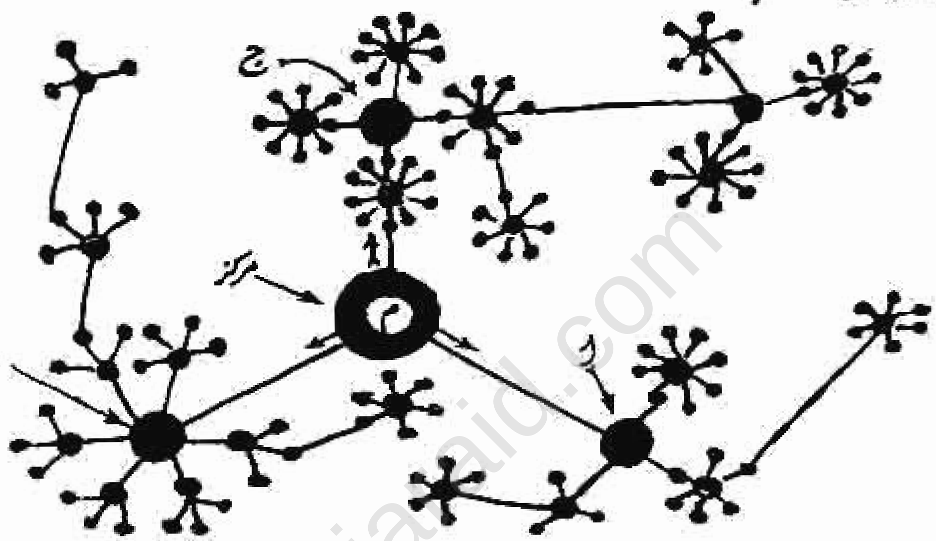

دیکھیے ایک جماعت کا مرکز م کس طرح ایک مرکزی پاور ہاؤس کی طرح ا، ب اور ج تبعی مراکز کو قوت بہم پہنچاتا ہے اور پھر یہ تبعی مراکز اپنے گرد مرید "تبع تابعین" فراہم کرتے اور انھیں قوت کا مرکز بناتے جاتے ہیں۔ اس طرح رفتہ رفتہ سوسائٹی کے اندر خاص نوعیت کے خیالات کا ایک غیر مرئی جالا سا تن جاتا ہے جس میں فرد فرد جکڑا جاتا ہے۔ اس جالے کا ساحرانہ اثر اخبار نویسوں، مصنفوں، مقرروں، اور ماہرین فنون کے دماغوں میں سرایت کر جاتا ہے اور ان کے ذریعہ سے ساری سوسائٹی پر چھا جاتا ہے۔ غلط اصول ہوں یا صحیح اصول، الہامی نظریات ہوں یا فلسفیانہ قیاسات، خدا پرستی ہو یا مادہ پرستی جس کو بھی نظام زندگی کی اساس بنا ہو اس کی کامیابی کا راستہ یہی ہے۔

قوت کی فراہمی

جماعتوں کی قوت کے اسرار سربستہ تین ہیں۔ (۱) تعدادی اکثریت یعنی کوئی جماعت آبادی کے زیادہ سے زیادہ حصہ کو اپنے اصولوں کا قائل اور اپنے نصب العین کا شیدائی بنا کر اپنے اندر جذب کر لے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

(۲) کیرکٹر یعنی جمع شدہ افراد کی سیرت کو نصب العین اور پروگرام کی ضروریات کے مطابق خاص سانچے میں ڈھال دیا جائے۔ (۳) رائے عامہ کی حمایت۔ یعنی عوام کے اس گروہ کو جو سربراہ کاری کی اہلیت نہیں رکھتا، اخلاقی طور پر اپنا معاون بنا لیا جائے۔ اس غرض کے لیے جو گروہ وسائل مروجہ کو زیادہ بہتر طریقہ پر استعمال کرے گا وہ غالب ہو نکلے گا۔ موجودہ نظام تمدن کے ماتحت تحریکیں عموماً حسب ذیل وسائل کے بل پر آگے بڑھتی ہیں۔

۱۔ پہلا وسیلۂ قوت پریس پر قبضہ کرنا ہے۔ اخبارات و رسائل جو موجودہ دور میں ذہنی انقلاب کا قوی ترین وسیلہ ہیں ان میں سرایت کیے بغیر کوئی بڑا انقلاب نمودار نہیں ہو سکتا۔ صرف اسی ذریعہ سے دنیا کی سیاسی اور سماجی حالت پر ایک نئے زاویہ سے نظر ڈالنا عوام کو سکھایا جا سکتا ہے۔ اور تخریبی تنقید سے رائج الوقت تہذیب یا سماج، یا سیاست کے خلاف بے اطمینانی پھیلائی جا سکتی ہے اور نئے نئے مقاصد کی طرف ذہنی رہبری کی جا سکتی ہے۔

۲۔ تعلیم۔ غالب نظام تعلیم کا ایسا نصاب نافذ کرتا ہے جو "قتل اطفال" کا ہم معنی ہو۔ وہ تو کالجوں اور یونیورسٹیوں سے اپنی ضرورت کے پرزے ڈھلوا تا ہے۔ لہٰذا انقلابی جماعتوں کے لیے ناگزیر ہوتا ہے کہ وہ کسی نہ کسی پیمانے پر مروجہ نظامِ تعلیم کے متوازی اپنا نظامِ تعلیم قائم کریں اور اس طرح نئی نسلوں کی ذہنیت کی تعمیر اپنی ضروریات کے مطابق کریں کہ انقلابی جنگ کے لیے سپاہی بھی مہیا ہونے لگیں اور مستقبل میں نئے نظام کی مشین کو چلانے کے لیے ڈرائیوروں کا قحط نہ حائل ہو۔

۳۔ جدید اختیار کردہ نظریات کی بنیاد پر لٹریچر کی تیاری۔ آج کل تعلیم کا دائرہ مدرسہ کی چار دیواری سے باہر دور تک پھیل گیا ہے۔ تعلیم یافتہ آدمی ساری عمر طالب علم بنا رہتا ہے کیونکہ زندگی کے مسائل بے شمار ہیں اور ان کے صحیح حل کی خواہش ذوقِ تحقیق اور ذوقِ مطالعہ پیدا کرتی ہے۔ ہمارے علم کی ہر شاخ اتنی وسعت اختیار کر چکی ہے کہ آج یونیورسٹیاں "اسپیشلسٹ" پیدا کرنے پر مجبور ہیں اور ہر تعلیم یافتہ آدمی اپنی علمی دلچسپیوں کو کسی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ایک شاخ پر مرتکز کر دیتا ہے لہٰذا ضروری ہے کہ ایک انقلابی تحریک اپنے نظریات کو علم کی ہر شاخ میں حل کر دے۔ وہ طبیعیات، نفسیات، اخلاق، علم السیاست، علم المعیشت، علم الاجتماع وغیرہ علوم میں سے ہر ایک کی روشنی میں اپنے اصولوں کا برحق اور مفید ہونا مبرہن کر دے۔ پھر اس کے ساتھ ساتھ شاعری، افسانہ اور ڈرامہ میں بھی انقلابی نظریے کا سمویا جانا ضروری ہے تاکہ جو لوگ خشک تحقیقی کا مذاق نہیں رکھتے یا تفکر کے لیے فرصت سے محروم ہیں اور محض تفریحی مطالعہ پر اکتفا کرتے ہیں، ان کے ذہن میں بھی نفوذ حاصل کیا جائے۔ اس علمی امامت کے بغیر دماغوں کو فتح کرنا ممکن نہیں۔

۴۔ اسٹیج پر قبضہ۔ یہ ایک آخری سا سنگ میل ہے۔ تقریر کا اثر بہت تیز اور وسیع ہوتا ہے۔ صحافت تعلیم اور لٹریچر تو بارود بچھانے کا کام کرتے ہیں اور خطابت اس کو فتیلہ دکھاتی ہے لیکن اس کام میں بڑی ہشیاری کی ضرورت ہے۔ اگر فتیلہ وقت سے پہلے دکھا دیا جائے تو بنا بنایا کام بگڑ جاتا ہے۔

اسٹیج سے انقلاب کی دعوت کو اس وقت بلند ہونا چاہیے جب "قیادت" کو ایک طرف سے تو یہ اطمینان ہو کہ عوام کی بے پناہ طاقت کو قابو میں رکھنے کے لیے سربراہ کاروں کا ایک قابلِ اعتماد گروہ موجود ہے اور دوسری طرف یہ محسوس ہو کہ ملک کی سیاسی فضا اور خارجی طاقتوں کے حالات تصادم کے لیے موافق ہو چکے ہیں۔

ان سارے ذرائع سے ایک انقلابی جماعت لوگوں کو ایک طرف مروجہ نظام کے خلاف سخت تنقید کر کے غیر مطمئن اور غیر مطمئن سے آمادہ بغاوت کرتی رہتی ہے۔ دوسری طرف وہ اپنے پسندیدہ اصول و نظریات کے برحق ہونے پر تعمیری افکار پیش کر کے لوگوں کو اپنا حامی بناتی ہے۔ اسے عوام کو اس یقین کی حد پر پہنچانا ہوتا ہے کہ ہم جو کچھ کرنا چاہتے ہیں وہ تمہارے لیے سراسر فائدہ پر مبنی ہے۔ اس تبلیغ افکار سے، پہلے قریب ترین لوگ متاثر ہوتے ہیں، پھر ذرا دور کے لوگ متاثر ہوتے ہیں، پھر اثر کا حلقہ مزید وسیع ہوتا جاتا ہے اور وہ مخالف عناصر بھی جماعت میں جذب ہونے لگتے ہیں۔ جو شبہات، قدامت پسندی، غلط فہمی، دیانتدارانہ اختلاف یا تعصب کی وجہ سے دور کھڑے تھے۔ حتیٰ کہ وہ آبادی جو آخر دم تک مخالفت کرتی ہے وہ بھی انقلاب کی رو کے بڑھ نکلنے کی صورت میں بے حوصلہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

و مایوس ہو کر سر جھکا دیتی ہے۔

تبلیغ افکار میں جان پڑتی ہے عمل سے۔ اگر عمل اور دعوت میں تضاد ہوگا اور تحریک کے داعیوں کی سیرت ان کی دعوت کے مطابق نہ ہوگی تو تحریک فیل ہو جائے گی۔ اور اس کا چلن اسی وقت تک رہ سکے گا جب تک ہاتھی کے دکھانے کے دانت فریب دینے کے قابل رہیں گے۔ الغرض جب انسانوں کی ایک کثیر تعداد کسی نظام پر رضامند نہیں رہتی تو اس کا چلنا محال ہو جاتا ہے چاہے وہ کیسی ہی عظیم الشان مادی قوتوں سے کیوں نہ مسلح ہو۔

نظامِ غالب اور اس کے حریف کے درمیان جو مقابلہ ہوتا ہے، اس کے بھی کچھ اصول ہیں۔ نظامِ غالب ساری جنگ مادی قوت کے بل پر لڑتا ہے وہ سنگین اور ردی کی مدد سے بازی جیتنے کی فکر کرتا ہے۔ بخلاف اس کے انقلابی تحریک اخلاقی قوت کے بل پر آگے بڑھتی ہے اور غیر متزلزل قوتِ ایمانی، اصول پرستی ایثار و قربانی اور خدمتِ انسانیت کے مظاہرہ سے عوام پر سکہ جماتی ہے۔ عوام سے اس کا رابطہ بڑھتے بڑھتے اس حد تک پہنچ جاتا ہے کہ وہ عوام کی ہمدردیوں کا مرکز بن جاتی ہے۔ نظامِ غالب مجبور ہوتا ہے کہ انھیں عوام میں سے ضروری کارندے حاصل کرے۔ ان کارندوں کے پیٹ تو حکومت کے بس میں ہوتے ہیں لیکن ان کے دل و دماغ پر انقلابی تحریک کا قبضہ ہو جاتا ہے۔ اس طرح ایک نظام کے انجن بالکل اپنے دشمنوں کے قبضے میں چلے جاتے ہیں۔ رہی سہی جو کسر ہوتی ہے وہ اندرونی فوجی بغاوت یا کسی بیرونی حملہ کی مدد سے پوری ہو جاتی ہے اور تاریخ میں اس کے لیے بار بار مواقع پیدا ہوتے رہتے ہیں۔

انقلابات کی اقسام انقلابات کا دائرہ جتنا محدود ہوتا ہے، اتنی ہی کم جدوجہد کی ضرورت ہوتی ہے اور اس دائرہ میں جتنی وسعت ہوگی، جدوجہد بھی اتنی ہی سخت کرنی پڑے گی۔ انقلاباتِ عالم کو اگر اس لحاظ سے تقسیم کیا جائے تو ان کو تین بڑے عنوانوں کے ماتحت جمع کیا جا سکتا ہے:۔

ا۔ حکومتی انقلابات۔

ب۔ سماجی انقلابات۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ج۔ تہذیبی انقلابات۔

محض حکومتی انقلابات کے داعی مروجہ اصولِ تہذیب اور سماج کی اساسی ہیئت سے تو مطمئن ہوتے ہیں لیکن بعض جزئی تغیرات کی خواہش کو جو حالاتِ وقت کے ماتحت بھڑک اٹھتی ہے، سیاسی ہیئت برسرِ عمل نہیں آنے دیتی تو لوگوں کے لیے ناگزیر ہو جاتا ہے کہ اس سیاسی ہیئت کو بہ جبر توڑ کر ایک نئی سیاسی ہیئت قائم کریں۔ یہ ایک علیحدہ بات ہے کہ سیاسی ہیئت کے بدل جانے سے سماجی ہیئت میں رفتہ رفتہ بہت بڑے تغیرات واقع ہو جاتے ہیں اور بعض اوقات اصولِ تہذیب پر اثر جا پڑتا ہے۔ اس کی مثال کے لیے تاریخ میں بے شمار انقلابات کی داستانیں محفوظ ہیں۔ قریب ترین دور میں سے آپ جرمنی کے انقلاب کو سامنے رکھ لیجیے۔ نازی پارٹی دراصل اس لیے وجود میں نہیں آئی تھی کہ اسے سماجی ہیئت کو توڑنا ہے بلکہ وہ "جمہوریت" کی پالیسی کو ملک کے لیے مضر سمجھتی تھی اور اس پالیسی کو ختم کرنے کے لیے اس نے مروجہ سیاسی ہیئت کو توڑ ڈالا۔ یہ الگ بات ہے کہ نئی سیاسی ہیئت کے پیٹ سے خود بخود سماج کا ایک نیا ڈھانچہ برآمد ہو تا گیا۔

رہے سماجی انقلابات، تو ان کے علمبرداروں کا مدعا یہ ہوتا ہے کہ نظامِ زندگی میں کچھ مرکزی تبدیلیاں کی جائیں لیکن یہ لوگ مروجہ اساسِ تہذیب سے متفق ہوتے ہیں، تاہم ان کے لیے بھی ناگزیر ہوتا ہے کہ حکومت کے اس نظام پر حملہ آور ہوں جو مروجہ نظامِ زندگی کے متعصبانہ تحفظ کے لیے وجود میں آتا ہے۔ اس کی مثال انقلابِ روس ہے۔ اشتراکیت، الحاد، زندگی بعد موت سے انکار، انسان کے حیوانی تصورِ حیات اور "زندگی برائے زندگی" وغیرہ اکثر اصولِ تہذیب میں سٹریٹ پوری طرح یورپ بالکل متفق ہے۔ زیادہ سے زیادہ وہ فرد اور سوسائٹی کی حدودِ عمل میں یورپ سے اختلاف کرتی ہے اور وہ بھی صرف اس لیے کہ اس کے بغیر سوسائٹی کا معاشی نظام اس نقشہ پر کھڑا ہی نہیں کیا جا سکتا جو اشتراکیت مرتب کرتی ہے۔ یہ سٹریٹ لمانہ جمہوریت سے لے کر آمریت تک اور آمریت سے لے کر مزدوروں کی خداوندی تک ایک ہی دورِ تہذیب کا سکہ رواں ہے۔ یہ سارے انقلاب اور تغیر اندرونی ہیں اور ابھی تک انسانیت کو ایک دور سے دوسرے دور میں منتقل کرنے والا انقلاب رونما نہیں ہوا۔

بخلاف مذکورۃ الصدر دونوں قسم کے انقلابات کے تہذیبی انقلاب نظامِ حیات کو جڑ سے بدل دیتا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تک بدل دینا چاہتا ہے۔ یہ نہ مروجہ اصول تہذیب سے راضی ہوتا ہے، نہ سماج کے خارجی ڈھانچہ سے اتفاق کرتا ہے اور نہ نظامِ سیاسی سے مطمئن ہوتا ہے۔ اس نوعیت کے انقلاب کی مثال عرب کا "اسلامی انقلاب" ہے۔

ان سب میں سے اول الذکر سہل ترین اور آخر الذکر مشکل ترین ہے۔ اول الذکر کے لیے تو یہ ممکن ہے کہ کسی اندرونی فوجی بغاوت یا کسی خارجی طاقت کی امداد سے ضروری تغیر برپا کر لے لیکن ثانی الذکر اور ثالث الذکر کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ سوسائیٹی کو پہلے اپنے پروگرام سے متحد کر لے ورنہ حکومت پر قبضہ پا لینے کے بعد بھی اصل مقصد حاصل نہیں ہوگا۔ پھر ان دونوں میں سے پہلے انقلاب کی تو یہ صورت بھی ہو سکتی ہے کہ ایک قوی پارٹی سیاسی غلبہ پا کر بہ جبر لوگوں پر ایک سماجی ہیئت کا نفاذ کر دے جیسا کہ روس میں عملاً ہوا ہے کہ ملک کی کثیر آبادی انقلاب کے خلاف تھی لیکن ایک فعال جمعیت نے جب قوت کے سرچشموں پر قابو پا لیا اور خون کے سیلاب بہا کر اپنا سکہ جما لیا تو لوگوں کے لیے سرِ انقیاد جھکا دینے کے سوا چارہ نہ رہا لیکن دوسرا انقلاب جبر کی راہ سے کامیابی حاصل نہیں کر سکتا کیونکہ کوئی مخصوص اصولِ تہذیب بہ جبر دماغوں میں نہیں اُتارے جا سکتے۔ تہذیبی انقلاب کا بیج تو محض "روح" میں بویا جاتا ہے، پھر وہ ایک وقت لے کر پھوٹتا ہے، پھر رفتہ رفتہ آخر میں "کلمہ طیبہ" ہو یا "کلمہ خبیثہ" برگ و بار لاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ثالث الذکر انقلاب کو بہت بڑی مزاحمتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اور اسی لحاظ سے اسے بہت زیادہ قوت فراہم کرنی پڑتی ہے۔

میدانِ مقابلہ کی وسعت انقلاب کی نوعیت کے علاوہ میدانِ مقابلہ کی وسعت بھی ایک اہم مسئلہ ہے جو قوت کی ضرورت کو گھٹاتی بڑھاتی ہے: تاریخ عالم نظریات کے میدانہائے مقابلہ کے لحاظ سے تین بڑے حصوں میں منقسم ہے۔

ا۔ قبائلی دور۔ ب۔ قومی دور۔ ج۔ بین الاقوامی دور۔

قبائلی دور میں اجتماعی انقلاب بالکل غیر محسوس ہوتا تھا، اتنا غیر محسوس کہ ہم بین الاقوامی دور کے لوگ اس پر اجتماعی انقلاب کے الفاظ کا اطلاق موزوں نہیں سمجھتے۔ قبائلی دور کے تنگ سے میدانِ عمل میں نظریات کی کشمکش ماحول چھوٹی چھوٹی قوتوں کے بل پر جاری رہتی تھی اور تاریخ کے پہیے کا محیط بہت چھوٹا تھا اس لیے ادل بدل تیزی سے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہوتا تھا اور دو انقلابات کے درمیان امن و سکون کی مدت بہت مختصر ہوتی تھی۔ اس دور میں کسی نظریے کا معیار خیر و شر قبیلوی مفاد تھا۔

پھر قومی دور آیا اور قبیلے ایک دوسرے میں تحلیل ہو کر اقوام کی شکل اختیار کر گئے۔ اور جہاں پہلے افراد کے درمیان کھینچا تانی ہوتی تھی وہاں اب بڑی بڑی پارٹیوں کے درمیان تاریخی کشمکش شروع ہو گئی۔ اب نظریات کی پرکھ قبیلوں کے نقطۂ نظر کی بجائے "قومی مفاد" کے نقطۂ نظر سے ہونے لگی۔ تاریخ کے چکر کا محیط پھیل گیا۔ انقلابات کا دوسرا نتیجہ وقفہ اسباب تمدن نے بڑھا دیا اور انقلابی تحریکیں بہت زیادہ قوت کی محتاج ہو گئیں۔

لیکن آج ایجادات و اختراعات اور تمدن کی ترقی نے قوموں اور ملکوں اور نسلوں کے درمیان کی دیواریں ہٹا دی ہیں۔ نظریات کی کشمکش کا میدان اب عالمگیر ہے۔ پوری نوع انسانی "ملت واحدہ" کی شکل میں تحلیل ہو رہی ہے۔ اس لئے آج نظریات کی پرکھ قومی مفاد کی کسوٹی کی بجائے انسانیت کے مجموعی مفاد کی کسوٹی پر ہو رہی ہے اور قومی مفاد کے پرستار بھی مجبور ہیں کہ انسانیت کا نام لے کر میدان میں اتریں اور عالمگیر اصلاح کا جھنڈا بلند کریں۔ اب میدان عالمگیر جماعتوں کے ہاتھوں میں جا رہا ہے۔ بڑے بڑے منظم گروہ جدید ذرائع سے دوسرے گروہوں میں نفوذ کر رہے ہیں۔ آج جو گروہ بھی کوئی آواز بلند کرتا ہے اسے دنیا بھر کے نظاموں پر تنقید کرنی پڑتی ہے، اسے اپنے مجوزہ نظام کے حق میں پبلک کی حمایت حاصل کرنے کیلئے ثابت کرنا پڑتا ہے کہ یہ نظام فی الواقع انسانی زندگی کے لیے بہترین ہے۔ لہٰذا اس دور میں کسی انقلاب کی علمبرداری کے لیے بڑی وسیع طاقت درکار ہے۔

خود ہندوستان کو دیکھیے۔ یہاں انگلینڈ کی سرمایہ دارانہ جمہوریت، جرمنی کی آمریت اور روس کا سوشلزم رسہ کشی میں مصروف ہیں۔ اب اگر ان کے مقابلہ میں اسلامی انقلاب کے داعی بھی اٹھیں تو انہیں حکومت متسلطہ پر جھپٹنے سے پہلے ان سارے نظریات کی قوتوں سے متصادم ہونا پڑے گا۔ پھر یہ انقلابی عناصر تو سیاسی یا سماجی ہیئت کو بدل دینے پر اکتفا کرتے ہیں لیکن اسلام اصول تہذیب، سماجی ہیئت اور سیاسی ادارہ سب کچھ بدل دینا چاہتا ہے۔ وہ تو پوری عمارت کو گرا کر ایک نئے نقشہ پر تعمیر کرنے والا ہے تاکہ موجودہ تاریک دور تہذیب کے یہ خون خرابے، یہ ردّ و معاوضہ، یہ ہاتھا پائیاں ختم ہوں اور ایک روشن دور تہذیب نمودار ہو جس میں انسان امن، آزادی اور اطمینان کا سانس لے سکے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اس دور میں اگر کوئی شخص اپنے خاندانی مفاد کے لیے لوگوں کو اپیل کرے تو آپ اسے احمق سمجھتے ہیں لیکن آپ خود انسانی مفاد کے بجائے قومی مفاد کا جھنڈا بلند کر کے یہی حماقت کر رہے ہیں"۔ "آزاد ہندوستان"[1] سے صرف ہندوستانیوں کو دلچسپی ہو سکتی ہے۔ "رام راج" صرف ہندوؤں کو اپیل کر سکتا ہے۔ "پاکستان" کا نعرہ صرف مسلمانوں کے دماغوں پر فتح پا سکتا ہے لیکن دنیا کو مخاطب کرنے کے لیے ایک "امت وسط" کی ضرورت ہے۔ یہ منصب خالی پڑا ہے۔ اور اس طاقت کے لیے خالی ہے جو بڑھ کر اس پر قبضہ کرے۔

"جو بڑھ کر خود اٹھا لے ہاتھ میں مینا اسی کا ہے"

یہ کام اس طرح ہو سکتا ہے کہ ایک نئی "تہذیبی امامت" کا سرچشمہ ابلنے لگے اور ایک نئی "روحِ عصر" نمودار ہو جو دنیا کی ذہنی فضا میں سرایت کر جائے اور اس میں ہر سانس لینے والا اسی طرح متاثر ہو کر رہ جائے جس طرح آج تک یورپ کی "الحادی روحِ عصر" سے کرۂ ارضی پر بسنے والا ہر شخص کم و بیش متاثر ہوتا رہا ہے۔

موجودہ تاریک دورِ تہذیب پر "دردِ زہ" کے جو دورے پڑ رہے ہیں یہ اپنی واضح علامات سے ایک مردہ بچے کے برآمد ہونے پر دلالت کرتے ہیں اور گمانِ غالب یہی ہے کہ یہ "ہونہار بچہ" اپنے ساتھ ماں کو بھی لے ڈوبے گا۔ تاریکی کی نسل کے اس انقطاع سے ایک نئے دورِ تہذیب کے ظہور کا راستہ کھل جائے گا۔ لیکن اس کا انحصار اس پر ہے کہ زندگی کے پاکیزہ اصولوں کو جانیں لڑانے والے بے لوث سپاہی ہاتھ آتے ہیں یا نہیں؟ ورنہ شر کی قوت "ابلیس کے تعویذ" سے پھر سنبھل سکتی ہے یا کم از کم تاریخ کے دو دوروں کے درمیان ایک ایسا "ٹھیراؤ" حائل ہو سکتا ہے جو ہونے والے واقعات کو ملتوی کر دے اور کام کرنے والی متضاد قوتیں ایک بہترین موقع

[1] ہندوستان کی ہر سیاسی طاقت اس لائن پر کام کرنا چاہتی ہے کہ پہلے قوم کو اپیل کر کے حکومت کی مشینری پر قبضہ کیا جائے اور پھر کوئی وسیع تر پروگرام سامنے نکالا جائے۔ حالانکہ ایک وسیع تر پروگرام پر بھی قوم اور قوم سے باہر کے لوگوں کو اپیل کیا جا سکتا ہے اور ایک جہانگیر پروگرام کے نام سے بھی حکومت کی کل پر قبضہ حاصل کیا جا سکتا ہے۔ اصل قوتِ عاملہ تو عوام کا ایک نصب العین پر دل و جان سے متحد ہو جانا ہے چاہے یہ نصب العین قومی ہو یا انسانی۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

گنوادیں۔ یہ وقت اصل میں تاریخ کو آگے دھکیلنے کا ہے۔ جو گروہ بھی یہ خدمت سرانجام دے گا تاریخ سازی کے منصب پر وہی فائز ہوجائے گا۔

بہرحال زندگی کی پیکارگاہ میں جو شخص اتار دیا گیا ہے اس کا فرض ہے کہ وہ اپنے منصب کا خود تعین کرے وہ سوچ لے کہ مختلف نظریات میں سے وہ کس کے لشکر کا سپاہی یا سپہ سالار بن سکتا ہے یا کیا اسے محض تماشائی بن کے رہنا پسند ہے؟ یہ زندگی کی پونجی کدھر صرف کی جاتی ہے؟

در سرائے ہست و بود آئی ؟ میا | از عدم سوئے وجود آئی ؟ میا
در بیائی چوں شرار از خود مرو | در تلاش خرمنے آوارہ شو
تاب و تب داری اگر مانندِ مہر | پا بنہ در وسعت آبادِ سپہر
کوہ و مرغ و گلشن و صحرا بسوز | ماہیاں را در تہِ دریا بسوز
سینہ داری اگر درخورِ تیر | در جہاں شاہیں بزی شاہیں بمیر

اطلاع

اخبار "زمزم" لاہور جو حکومت کی بعض پابندیوں کی بنا پر بند ہوگیا تھا، اب پھر جاری ہوگیا ہے

مولانا ابوالاعلیٰ صاحب مودودی کے ان مضامین کا مجموعہ، جو مسئلۂ جبر و قدر کی تحقیق پر "ترجمان القرآن" میں شائع ہوتے رہے ہیں، اب پہلی مرتبہ کتابی شکل میں طبع ہوکر آگیا ہے۔ جن صاحب کو ضرورت ہو طلب فرماسکتے ہیں

مینجر مکتبہ "ترجمان القرآن" دارالاسلام جمال پور ضلع گورداسپور

© rasailojaraid.com